اس شمارے میں

حرفِ اوّل

رجوع الی القرآن کورس — حافظ عاطف وحید — 2

مطالعہ قرآن حکیم

جہاد بالقرآن — ڈاکٹر اسرار احمد — 3

فہم القرآن

ترجمہ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح — لطف الرحمٰن خان — 30

نباتاتِ قرآن

نخل (کھجور) — سید قاسم محمود — 41

فکر و نظر

قرآن مجید: کلام الٰہی یا عبارتِ کلام الٰہی؟ — حافظ محمد زبیر — 49

تعارف و تبصرہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 60

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

حکمت قرآن

ماہنامہ — لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

حافظ عاطف وحید

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۴ — شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ۔ ستمبر ۲۰۰۵ء — شمارہ ۹

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرتعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجوع الی القرآن کورس میں نئے داخلے

تقریباً نو ماہ کے دورانیے پر مشتمل ''رجوع الی القرآن کورس'' مرکزی انجمن خدام القرآن کی تعلیمی مساعی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ کورس بحمد اللہ بیس بائیس سال سے انتہائی پابندی کے ساتھ منعقد کیا جا رہا ہے اور اب تک کثیر تعداد میں خواتین وحضرات اس کورس سے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان کر چکے ہیں۔ اس سال بھی ان شاء اللہ العزیز ۵ ستمبر سے اس کورس کا نیا سیشن شروع ہو رہا ہے جس میں اب تک پچاس کے قریب خواتین وحضرات اپنا داخلہ کنفرم کروا چکے ہیں۔ اتنی کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ خواتین وحضرات کا فہم قرآن کے حصول کے لیے سال بھر کا وقت فارغ کرنے کا فیصلہ کر لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ابھی سعادت سے بانجھ نہیں ہوا اور اس میں دعوت الی الخیر اور رجوع الی القرآن کی پکار پر لبیک کہنے والے موجود ہیں۔ اس کورس کے شرکاء کی بڑھتی ہوئی تعداد سے اس حقیقت کی غمازی بھی ہوتی ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے آج سے قریباً چالیس سال قبل رجوع الی القرآن کا جو پودا لگایا اور اسے ایک طویل عرصے تک اپنے خونِ جگر سے سینچا' اب وہ ایک تناور درخت بن کر برگ وبار لا رہا ہے۔

رجوع الی القرآن کورس سے ہر سال استفادہ کرنے والے مرد وخواتین میں سے کچھ نہ کچھ تعداد ایسی سعید روحوں کی بھی ضرور نکل آتی ہے جو دروسِ قرآن کے حلقوں اور تدریس عربی کی کلاسز کے ذریعے تعلّم وتعلیم قرآن کے اس ''بہترین'' کام میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس سال اس کورس کو جن اساتذۂ کرام کی رفاقت وراہنمائی میسر ہے وہ سب اسی کورس کے فارغ التحصیل ہیں اور اب اعزازی طور پر تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

کورس کو ترتیب دیتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ شرکاء نہ صرف عربی زبان کے بنیادی قواعد اور اسالیب سے واقف ہو جائیں تاکہ قرآن حکیم کی ابدی ہدایت سے براہِ راست استفادے کی راہ ہموار ہو سکے' بلکہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے مربوط مطالعے کے ذریعے دین کا صحیح تصور اور فرائض دینی کا ایک جامع خاکہ بھی ان پر واضح ہو جائے۔ مزید برآں مطالعۂ احادیث نبویؐ کا ایک مختصر نصاب' تجوید' ترجمہ وترکیب قرآن اور مطالعۂ فقہ بھی شاملِ نصاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز کے تعلّم وتعلیم کے ضمن میں ہونے والی جملہ مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ ○○

جہاد بالقرآن

صدر مؤسس مرکزی انجمن محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
کا ایک جامع خطاب

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی ..... امّا بعد:

فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ــ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۝﴾ صدق اللہ العظیم

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے' اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ''جہاد'' جو اِس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے' ایک فعل امر کے طور پر ''جَاهِدْ'' اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ''جِهَادًا كَبِيْرًا'' ــــــ یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد' بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ''بِہٖ'' آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ''آپؐ ان سے جہاد کیجئے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

یہاں ''بِہٖ'' کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے' میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ''بِہٖ'' بطور ضمیر مجرور آیا ہے' ہمارے اہلِ علم' الّا ماشاء اللہ' اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ''بِہٖ'' کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال سورۂ بنی اسرائیل سے ہے' جہاں فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ' یہ بڑھوتری ہے آپؐ کے لیے''۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت' اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے' کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو' لیکن اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی ''بِهٖ'' پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام' وہ بھی طویل قیام' اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۙ﴾ (المزمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو' مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں' پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے' لیکن اس کی برکات سے کما حقہٗ استفادہ تب ہوگا جب اِس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی ہے' جہاں فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾

''پس یقیناً (اے نبیؐ!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے' تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کرو۔''

یہاں بھی غور فرمایئے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام

اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ زیر نظر آیتِ کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شدّ و مدّ کے ساتھ' اس اہتمام کے ساتھ' اس تاکید و زور (emphasis) کے ساتھ' تو اس کے لیے ایک ذریعہ' ایک آلہ' ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دستِ مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ لہٰذا ارشاد ہوا: ''اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکین و کفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ''جہاد'' کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (concept) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم ہوئے' نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی و فکری اعتبار سے بھی۔ یعنی ہم دو طرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ اُس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء و تمسخر کا معاملہ ہوا۔ انہی کا یہ الزام ہے کہ: ع ''بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!'' چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دَور اصلاً گزر چکا ہے' لیکن تا حال اس کے باقیات السیّئات کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں' اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت' پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو'

اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُوررس ہیں کہ جہاد کے معنی ''جنگ'' ہیں۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں۔ اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ''جنگ'' ہی قرار دیا جب کہ قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے' ایک ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور دوسری ''قتال فی سبیل اللہ''۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطورِ عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ''جہاد'' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی' لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اوّل کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا' حتیٰ کہ ذہنوں سے اَوجھل اور محو ہو گیا۔ الّا ماشاء اللہ!

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے' صرف اپنے مفادات کے لیے' صرف اپنے اقتدار کو

وسعت دینے کے لیے' اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے' جبکہ اُن کے پیشِ نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو' اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی' جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ :((مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا' اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے' ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لیے' تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہوگی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ''صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو اس لیے جنگ کرے تاکہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔''

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لیے کی جائے' نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہرحال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا' اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہوگا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد بابِ مفاعلہ سے ہے اور بابِ مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے' جیسے بحث سے مباحثہ' جہد سے مجاہدہ

اور جہاد' اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دوطرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے' کسی نے گولی ماردی یا خنجر گھونپ دیا در آنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا' یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم' کوششوں کا ٹکراؤ' کوششوں کا مقابلہ ـــــ جس کے لیے ایک لفظ ہوگا ''کشمکش'' یا ''کشاکش''۔ انگریزی میں اسے کہیں گے: struggle۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے' کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دُور کرنے کے لیے اس سے کشمکش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

فرائضِ دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور وفکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور وفکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں ـــــ میں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں' مجھے اہلِ علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہوگی۔ میں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِ تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردّد نہیں کروں گا' بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو

ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل: عبادتِ ربّ

فرائض دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ' ہمہ تن اور ہمہ وقت ہوگی' جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ (الزمر)

''اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کر لو (اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو) اس سے پہلے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے' پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی''

اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام' سرِ تسلیم خم کرنا' گردن نہادن' to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا' جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

"To give up all kinds of resistance whole heartedly."

یعنی ''خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا''

جبکہ ''تقویٰ'' کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں

چوٹی کی آیت ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔''

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ''عبادت''۔ اس میں اسلام' اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظِ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں' جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ''بندگی'' اور ''پرستش''۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں۔ اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے' جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ﴾ ''پس (اے نبیؐ!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ پھر سورۃ البیّنۃ میں ان دونوں کو نہایت حسین و جمیل اسلوبِ بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ.....﴾ (آیت ۵) ''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے' بالکل یکسو ہو کر''۔ قرآنِ مجید میں جن و اِنس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ ربّ قرار دی گئی ہے' از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے''۔

فرائض دینی کی اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لیے ایک بندۂ مؤمن کو سہ گونہ جہاد کرنا پڑے گا' یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔ ''اَمَّارَة'' اَمر سے مبالغہ کا صیغہ ہے' یعنی بہت ہی زیادہ اکسانے والا' نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۱) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))(۲) ''اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے''۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہوگی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے' ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد

(۱) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجہاد۔

''مجاہدہ مع النفس'' ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ''حماقت'' ہے۔

نفس امارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے' وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اِس نفس کو تقویت پہنچائے' اس میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّ اِبْلِیْسَ لَهٗ خُرْطُوْمٌ کَخُرْطُوْمِ الْکَلْبِ وَاضِعُهٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ یُذَکِّرُ الشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَیَاْتِیْهِ بِالْاَمَانِیِّ وَیَاْتِیْهِ بِالْوَسْوَسَةِ عَلٰی قَلْبِهٖ لِیُشَکِّکَهٗ فِیْ رَبِّهٖ))

''ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے کتے کی تھوتھنی کی طرح۔ وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے' وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں (wishful thinking) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے' تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے''۔

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ))(۱)

''شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے۔''

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:۶) ''(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اسے دشمن سمجھو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارة المرأة زوجها فی اعتکافه۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انه یستحب لمن رؤی خالیا بامرأة وکانت زوجته او محرما له ان یقول : هذه فلانة ' لیدفع ظن السوء به۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصیام' باب المعتکف یدخل البیت لحاجته۔

(دشمن جانو)۔'' اور سورۃ الکہف میں بڑا پیارا انداز ہے' جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝﴾

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنوں میں سے تھا' سو اُس نے اپنے ربّ کے حکم سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت (صلبی و معنوی) کو اپنا دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے بہت ہی برا بدلہ ہے''۔

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی' مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صلبی و معنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ''شکست'' سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ''نالۂ ابلیس'' کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں' میرے مقابلے کا نہیں' ایک مشتِ خس ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است! مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے۔

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست!

''الٰہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے' تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہو سکوں''۔

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے' اس سے ہوگی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا' وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا۔ ع

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز!''

''زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کرلو!''

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا' کوئی کشمکش نہیں ہوگی' کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ دُنیوی نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہوگی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کرلو۔ لیکن غیرت وحمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے ع

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!''

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعتہً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت وتقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت ومنفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرم ﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچایئے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق

ادا نہ کیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!'' مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) ''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلائیے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔''

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے' اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!''

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو' اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے' مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں' لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں' الا ماشاء اللہ' چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر''، یعنی نیکیوں کا پرچار' اُن کی تلقین' اُن کا حکم اور برائیوں سے' بدی سے لوگوں کو روکنا' بدی اور برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے' اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت و تلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم از کم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ و تاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔''

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابلِ التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ فِیْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ' ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ' فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَ ھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ))(۲)

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان (۲) حوالہ سابقہ

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا' اس کی امت میں اس کے ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریین کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ہے ہمارے دین میں نہی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس''۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ''عبادت'' بیان کی تھی' دوسری منزل کے لیے ''شہادت علی الناس'' جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمد ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی اُمت بھی آخری اُمت ہے۔ یہ اُمت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے تا کہ تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔''

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے' ایک خاص مقصد کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے)۔''

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ﴾

اس کے بعد اُمت کے اجتباء (چن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾

''تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوعِ انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ''۔

یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تاکہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو' testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسول کا' لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کارِ رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضور ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہٰذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ''دین الحق'' کو بالفعل قائم کر کے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگائیے' فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴾ (النساء)

''اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور (اے نبیؐ!) ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!''

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے' وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر اُن پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجئے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ

تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے۔ (۱) نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے گواہی لے لی: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف، پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اُمت کا اجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اُمت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو، حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمدللہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔ اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جا سکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

---

(۱) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

''پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے، کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)''۔ (جمیل الرحمٰن)

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧)

اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ یعنی ''تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے ربّ کی جانب سے''۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضور ﷺ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ۔'' یہاں ''عَنِّیْ'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا ''on my behalf''۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم ﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ ''اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغِ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔'' میں نے ترجمہ میں لفظ ''بالفرض'' کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے' ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوبِ بیان درحقیقت امت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری اُمت پر بحیثیت کُل اور ہر مسلمان پر بحیثیتِ اُمتیٔ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی' اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (النحل:١٢٥)

''(اے نبیؐ) دعوت دو اپنے ربّ کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ'

اور عمدہ وعظ ونصیحت کے ساتھ' اور (ہٹ دھرم' ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔''

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں' یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم وبیش آدھ سیر کا ہوگا' لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے' لیکن کس شے کو پکڑے' کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں' لیکن کس سمت میں چلیں' کس میں نہ چلیں' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ' برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا' یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو''۔

اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی وفکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہین اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے' لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا' اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ ''اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے ربّ کے راستے کی طرف

دعوت دیجیے''۔اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''اور جس کو حکمت و دانائی ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)۔'' مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں ''حکمت'' کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیتِ مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے' اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے' لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے' درحقیقت اس کا مفہوم حکمت عملی نہیں ہے' بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ' دانائی کے ساتھ' اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اِس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جا سکے تو معاشرہ بحیثیتِ مجموعی کبھی متاثر نہیں ہو سکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ''عوامی'' ہے۔عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے دی جائے گی' کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ان کے لیے ضرورت ہے موعظہ حسنہ کی' وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری' علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا' بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیر خواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے' ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ والا معاملہ نہیں ہے' بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں' ایک موعظہ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیزد بر دل ریزد' اور ع

''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!''

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے ''اجی وعظ کہہ رہے ہیں''۔حالانکہ

وعظ بڑی عظیم اور مؤثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے' لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تأثیر دکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہوگا تو غیر مؤثر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ۔ یعنی ''کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا''۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے' وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں' جو کبھی مان کر نہیں دیتے' جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں' جن کی امداد باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں' جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کور چشم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا۔ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصص (Specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں در آئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے' داد مل رہی ہے' تحسین ہو رہی ہے' تالیاں بج رہی ہیں' نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری (Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور برہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات' راجح و مرجوح' افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور

دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں' جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعّال ہوگئی ہے (۱)۔ قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا' بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الّا ماشاء اللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے' اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا' اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہو گیا ہوتا جس کا نامِ نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے' رحمۃ اللہ علیہ' تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانویؒ خم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانویؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ' بلکہ تمہارا دا عیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ؎

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے' اور محض خالی نہیں ہے' بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے' یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا' جبکہ طبیعیات' معاشیات' عمرانیات' سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے' ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوینِ نو نہیں ہو گی' تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا' ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ)) کو اپنا اصولِ عمل (Motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہو گا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (Talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے' ولولہ ہے' اُمنگ اور جذبہ ہے' وہ آگے بڑھیں' ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے اپنا دُنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں' تب جا کر ہی یہ کام ہو گا۔ اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ـــــ دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔ دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے' وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا' اس کی مذمت کرنا۔ اور تیسری سطح یہ ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا' اس پر گھٹن محسوس کرنا' اس پر پیچ و تاب کھانا۔ اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ''جہاد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ''نظریاتی کشمکش'' یا ''فکری تصادم'' ہے۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں' ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہوگا۔ آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ''جہاد'' مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے' ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔ جو نوجوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آ جائیں۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت

تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے حقیقتِ نفس الامری ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

تیسری منزل۔غلبہ واقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن' سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے' قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے' اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے' اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے' جہاد کرنا۔ جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾ ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾۔ یہ ہے جہاد کی بلند ترین چوٹی اور سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔ اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے' اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُرامن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابلِ عمل ہے ——— اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اِس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظامِ اجتماعی (Law of the Land) سرکارِ انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی

معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہرحال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں' اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں' لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں' بلکہ دین ہے' جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا' صرف مذہب بن گیا تھا' لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے' یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی' یعنی تبلیغ' دین کو پہنچانا' اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ

دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِ قلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا' یہ ہے ہمارے فرائض دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل۔

(جاری ہے)

احیاء علوم

- ایک متحرک' اُمید افزا' زندہ جریدہ جس کا دھارا روشن مستقبل کی طرف بہتا ہے
- ایک فکری سنگم جہاں مذہب' فلسفہ اور سائنس آ کر ملتے ہیں
- علم دوست حضرات و خواتین کے لئے فکر انگیز اور معلومات افزا تحریروں کا انتخاب
- اسلام اور سائنس میں دوستی کروانے والی' کسی بھی زبان میں چھپنے والی قدیم و جدید کتابوں کی تلخیصات' تعارفات' اقتباسات
- دنیا بھر کی احیائی تحریکوں کی اطلاعات' علوم جدیدہ میں ہونے والی تحقیق و ترویج سرگرمیاں

قیمت: 20 روپے ـــــ سالانہ: 200 روپے

ادارہ نشأۃ اسلامیہ
Institute of Islamic Renaissance
35-B, Iqbal Avenue, Johar Town II,
Lahore-54770, Pakistan
Tel: 042-5181643
e-mail: shahkarf@yahoo.com

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

نظر ثانی: حافظ محمد زبیر

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۶۴

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾

ل ی ل

ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

لَیْلٌ (اسم جنس): رات۔ اس کی جمع لَیَالٍ اور واحد لَیْلَةٌ ہے۔ ﴿ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴾ (مریم) ''تیری نشانی ہے کہ تو کلام نہیں کرے گا لوگوں سے تین راتیں مکمل۔'' ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ (القدر) ''بیشک ہم نے نازل کیا اس کو قدر کی رات میں۔''

ف ل ك

فَلَكَ (ن) فَلْكًا: کسی چیز کا انڈے کی مانند گول ہونا' بیضوی ہونا۔

فُلْكٌ (اسم ذات): کشتی (کیونکہ یہ بیضوی ہوتی ہے)۔ یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔

فَلَكٌ (اسم ذات): سیاروں کی گردش کرنے کا مقررہ راستہ' مدار (کیونکہ آسمان میں ہر گردش کرنے والی چیز کا مدار بیضوی ہے)۔ ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء) ''سب کسی مدار میں تیرتے ہیں۔''

ب ث ث

بَثَّ (ن) بَثًّا: کسی چیز کو منتشر کرنا' بکھیرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

بَثٌّ (اسم ذات): پراگندگی (غم کی شدت کی وجہ سے)۔ ﴿اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ (یوسف:۸۶) ''میں تو بس بیان کرتا ہوں اپنی پراگندگی اور اپنا غم اللہ سے۔''

مَبْثُوْثٌ (اسم المفعول): منتشر کیا ہوا' بکھیرا ہوا۔ ﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝﴾ (القارعۃ) ''جس دن ہوں گے لوگ بکھیرے ہوئے پتنگوں کی مانند۔''

اِنْبَثَّ (انفعال) اِنْبِثَاثًا: کسی چیز کا منتشر ہونا' بکھر جانا۔

مُنْبَثٌّ (اسم الفاعل): منتشر ہونے والا' بکھرنے والا۔ ﴿فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْۢبَثًّا ۝﴾ (الواقعۃ) ''پھر وہ ہو غبار بکھرنے والا ہوتے ہوئے۔''

د ب ب

دَبَّ (ض) دَبًّا: زمین پر گھسٹ کر چلنا' رینگنا۔

دَابٌّ (فَاعِلٌ کے وزن پر): چلنے والا' رینگنے والا۔ لیکن یہ اسم جنس کے طور پر آتا ہے۔ اس کی جمع دَوَابُّ اور دَابَّةٌ ہے۔ ﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الانفال) ''بیشک زمین پر چلنے والے تمام جانداروں میں سے بدترین اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔'' دَابَّةٌ کے لیے آیت زیر مطالعہ دیکھیں۔

ص ر ف

صَرَفَ (ض) صَرْفًا: کسی کو کسی سے پھیر دینا' ہٹا دینا۔ ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۱۴۶) ''میں پھیر دوں گا اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں۔''

اِصْرِفْ (فعل امر): تو پھیر دے، ہٹا دے۔ ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ﴾ (الفرقان:٦٥) ''اے ہمارے ربّ! تو ہٹا دے ہم سے جہنم کے عذاب کو۔''

مَصْرِفٌ (اسم الظرف): پھیرنے کی جگہ۔ ﴿وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا﴾ (الکھف) ''اور وہ لوگ نہیں پائیں گے اس سے پھیرنے کی کوئی جگہ یعنی کوئی راستہ۔''

صَرَّفَ (تفعیل) تَصْرِیْفًا: کثرت سے پھیرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ زیادہ تر دو معنوں میں آتا ہے: (۱) کسی کو بار بار گھمانا۔ (۲) کسی بات کو بار بار بیان کرنا۔ ﴿كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ﴾ (الاعراف) ''اس طرح ہم بار بار بیان کرتے ہیں آیتوں کو ایسے لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں۔''

اِنْصَرَفَ (انفعال) اِنْصِرَافًا: کسی سے پھر جانا۔ ہٹ جانا۔ ﴿ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (التوبۃ:١٢٧) ''پھر وہ لوگ پھر گئے تو اللہ نے پھیر دیا ان کے دلوں کو۔''

س ح ب

سَحَبَ (ف) سَحْبًا: کسی کو گھسیٹنا۔ ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ ۭ﴾ (القمر:٤٨) ''جس دن وہ لوگ گھسیٹے جائیں گے آگ میں اپنے چہروں کے بل۔''

سَحَابٌ (اسم ذات): بادل (کیونکہ وہ آبی بخارات کو گھسیٹتا ہے)۔ آیت زیر مطالعہ۔

س خ ر

سَخَرَ (ف) سُخْرًا: کسی سے بلا معاوضہ یعنی اعزازی طور پر کام لینا۔ بیگار لینا۔

سَخِرَ (س) سَخَرًا: کسی سے مذاق کرنا۔ ﴿فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ﴾ (التوبۃ:٧٩) ''تو وہ لوگ مذاق کرتے ہیں ان سے۔ مذاق کیا اللہ نے ان سے۔''

سَاخِرٌ (اسم الفاعل): مذاق کرنے والا۔ ﴿وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ﴾ (الزمر) ''اور میں تھا مذاق کرنے والوں میں سے۔''

سِخْرِیٌّ (اسم نسبت): مذاق والا (جس سے مذاق کیا جائے)، مذاق کا نشانہ۔ ﴿فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا﴾ (المؤمنون:١١٠) ''پھر بنایا تم لوگوں نے ان کو مذاق کا نشانہ۔''

سُخْرِیٌّ (اسم نسبت): بیگار والا (جس سے بیگار لیا جائے)، دوسروں کے کام آنے والا۔ ﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ﴾ (الزخرف:٣٢) ''تاکہ ان کا کوئی بنائے کسی کو کام

آنے والا۔'' یعنی ایک دوسرے کے کام آئیں۔

سَخَّرَ (تفعیل) تَسْخِیْرًا: کثرت سے بیگار لینا' کسی کو مطیع کرنا۔ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ﴾ (ابراھیم:۳۲) ''اور اس نے مطیع کیا کشتی کو تا کہ وہ چلے سمندر میں اس کے حکم سے۔''

مُسَخَّرٌ (اسم المفعول): مطیع کیا ہوا۔ آیت زیر مطالعہ۔

اِسْتَسْخَرَ (استفعال) اِسْتِسْخَارًا: کسی کا مذاق اڑانا۔ ﴿وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ۝﴾ (الصّٰفّٰت) ''اور جب بھی وہ لوگ دیکھتے ہیں کوئی نشانی تو مذاق اڑاتے ہیں۔''

ترکیب: ''اِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ہے۔ ''فِیْ'' حرف جار۔ ''خَلْقِ'' مجرور ہے۔ ''السَّمٰوٰت'' مضاف الیہ ہے۔ ''واؤ'' عاطفہ اور ''الْاَرْضِ'' معطوف ہے۔ پھر ''واؤ'' عاطفہ اور ''اِخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ'' معطوف ہے۔ پھر ''واؤ'' عاطفہ ہے اور ''الْفُلْكِ'' معطوف ہے۔ ''الَّتِیْ'' اسم موصول ہے جو اپنے صلہ کے ساتھ مل کر ''الْفُلْكِ'' کی صفت بن رہا ہے اور حالتِ جر میں ہے۔ ''تَجْرِیْ'' فعل مضارع ''هِیَ'' ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے۔ ''فِی الْبَحْرِ'' جار مجرور مل کر متعلق فعل ہو کر جملہ خبریہ ہوا۔ یہ جملہ خبریہ ''الَّتِیْ'' کا صلہ ہوا۔ موصول صلہ مل کر اپنے ماقبل کی صفت ہوا۔ ''بِ'' حرف جار ہے۔ ''مَا'' موصولہ ہے۔ ''یَنْفَعُ'' فعل مضارع ''هُوَ'' ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے۔ ''النَّاسَ'' مفعول ہے۔ فعل اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر جملہ خبریہ ہو کر صلہ ہوا۔ موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مجرور ہوا ''باء'' جارہ کے لیے۔ جار مجرور مل کر ''تَجْرِیْ'' فعل کے متعلق ہوا۔ ''واؤ'' عاطفہ ہے۔ ''مَا'' موصولہ ہے۔ ''اَنْزَلَ'' فعل ماضی' لفظ ''اللّٰهُ'' اس کا فاعل ہے۔ ''هٗ'' ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''وَمَا اَنْزَلَهٗ''۔ یہ جملہ صلہ بن رہا ہے ''مَا'' موصولہ کا۔ ''مِنْ'' جار ''السَّمَاءِ'' مجرور ہے۔ پھر ''مِنْ'' جار ''مَآءٍ'' مجرور ہے۔ ''فَا'' عاطفہ ہے جو سبب بیان کر رہی ہے۔ ''اَحْیَا'' فعل ماضی ہے ''هُوَ'' ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے۔ ''بِ'' جارہ ''هٖ'' ضمیر مجرور متصل ہے۔ جار مجرور مل کر فعل ماضی کے متعلق ہوئے۔ ''الْاَرْضَ'' مفعول بہ ہے۔ ''بَعْدَ'' مضاف ظرف زمان ہے' اس لیے مفعول فیہ بن رہا ہے۔ ''مَوْتِهَا'' مضاف' مضاف الیہ ہے۔ ''واؤ'' عاطفہ ہے۔ ''بَثَّ'' فعل ماضی ہے۔ ''فِیْهَا'' جار مجرور مل کر متعلق فعل ہوا۔ ''مِنْ'' تبعیضیہ حرف جار اور ''كُلِّ'' مجرور مل کر متعلق

ہے مفعول ''بَثَّ'' کا جو محذوف ہے۔ ''دَابَّةٍ'' مضاف الیہ ہے۔

''واؤ'' عاطفہ ''تَصْرِيْفِ'' معطوف علی ''السَّمَاءِ'' ہے۔ ''الرِّيَاحِ'' مضاف الیہ ''واؤ'' عاطفہ ''السَّحَابِ'' موصوف معطوف ہے۔ ''الْمُسَخَّرِ'' ماقبل کی صفت ہے۔ ''بَيْنَ'' ظرف مکان ہے جو کہ اسم مفعول ''الْمُسَخَّرِ'' کے متعلق ہے۔ ''السَّمَآءِ'' مضاف الیہ ہے۔ ''واؤ'' عاطفہ ''الْاَرْضِ'' معطوف ہے۔ ''لَاٰيٰتٍ'' میں ''لام'' لام تاکید اور ''اٰيَاتٍ'' اِنَّ کا اسم ہے جو کہ مؤخر ہے۔ ''لِقَوْمٍ'' میں ''لام'' حرف جار ''قَوْمٍ'' مجرور ہو کر متعلق ہوا ''آيَاتٍ'' کی صفت محذوف کے ساتھ۔ ''يَعْقِلُوْنَ'' فعل مضارع ہے۔ ''هُمْ'' ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے۔ فعل فاعل جملہ خبریہ ہو کر ''قَوْمٍ'' کی صفت ہوا۔

ترجمہ:

اِنَّ : بے شک	فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ : اور دن اور رات کے اختلاف میں	وَالْفُلْكِ الَّتِيْ : اور کشتی میں جو
تَجْرِيْ : چلتی ہے	فِي الْبَحْرِ : سمندر میں
بِمَا : اس کے ساتھ جو	يَنْفَعُ : فائدہ دیتا ہے
النَّاسَ : لوگوں کو	وَمَآ : اور اس میں جو
اَنْزَلَ : اُتارا	اللّٰهُ : اللہ نے
مِنَ السَّمَآءِ : آسمان سے	مِنْ مَّآءٍ : کچھ پانی میں سے
فَاَحْيَا : پھر اس نے زندہ کیا	بِهٖ : اس سے
الْاَرْضَ : زمین کو	بَعْدَ مَوْتِهَا : اس کی موت کے بعد
وَبَثَّ : اور اس نے پھیلایا	فِيْهَا : اس میں
مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ : تمام چلنے والے جانداروں میں سے	وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ : اور ہواؤں کے گھمانے میں
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ : اور مطیع کیے ہوئے بادل میں	بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ : زمین اور آسمان کے درمیان
لَاٰيٰتٍ : یقیناً نشانیاں ہیں	لِقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے

یَعْقِلُوْنَ: جو عقل سے کام لیتے ہیں

آیت ۱۶۵

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾﴾

ح ب ب

حَبَّ (ض) حُبًّا: پسند کرنا' پیار کرنا' محبت کرنا۔

حَبَّ (ک) حِبًّا: پسندیدہ ہونا' پیارا ہونا' محبوب ہونا۔

اَحَبُّ ج اَحِبَّاءُ (افعل التفضیل): زیادہ پیارا۔ ﴿وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ﴾ (التوبۃ:۲۴) ''اور مکانات' تم لوگ راضی ہو جن سے' زیادہ پیارے ہیں تم کو۔'' ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۸) ''ہم لوگ اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے زیادہ پیارے ہیں۔''

حُبٌّ (اسم ذات): پیار' محبت' آیت زیر مطالعہ۔

حَبٌّ واحد حَبَّةٌ (اسم جنس): دانہ۔ (کیونکہ یہ کسانوں کو بہت پیارا ہوتا ہے)۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ (الانعام:۹۵) ''بیشک اللہ دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا ہے۔'' ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ (البقرۃ:۲۶۱) ''ان لوگوں کی مثال جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایک ایسے دانے کی مثال کی مانند ہے جو اگائے سات بالیں۔''

اَحْبَبَ (افعال) اِحْبَابًا: پیار کرنا' محبت کرنا۔ (یہ مادہ باب ضَرَبَ اور باب افعال میں ہم معنی ہے' لیکن اس معنی میں قرآن مجید میں یہ صرف باب افعال سے آیا ہے)۔ ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶) ''یقیناً آپ ہدایت نہیں دیتے اس کو جس کو آپ چاہیں اور لیکن (یعنی بلکہ) اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس کو وہ چاہتا ہے۔''

حَبَّبَ (تفعیل) تَحْبِيْبًا: کسی کو کسی کے لیے پیارا بنا دینا۔ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ﴾ (الحجرات:۷) ''بلکہ اللہ نے پیارا بنایا تمہارے لیے ایمان کو۔''

اِسْتَحَبَّ (استفعال) اِسْتِحْبَابًا : کسی کو کسی پر ترجیح دینا' پسند کرنا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ﴾ (ابراھیم:۳) ''وہ لوگ جو ترجیح دیتے ہیں دنیا کی زندگی کو آخرت پر۔''

ترکیب : ''واؤ'' استینافیہ۔ ''مِنْ'' حرف جار ''النَّاسِ'' مجرور۔ جار و مجرور مل کر متعلق بخبر مقدم جو محذوف ہے۔ ''مَنْ'' اسم موصول مبتدأ موخر ہے۔ ''یَتَّخِذُ'' فعل مضارع ہے۔ ''ھُوَ'' ضمیر مستتر فاعل ہے۔ ''مِنْ'' حرف جار ''دُوْنِ'' مجرور' لفظ ''اللّٰہِ'' مضاف الیہ ہے۔ ''اَنْدَادًا'' مفعول بہ ہے۔ ''یُحِبُّوْنَھُمْ'' فعل مضارع ''واؤ'' ضمیر بارز متصل اس کا فاعل ہے۔ ''ھُمْ'' ضمیر مفعول ہے۔ فعل اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر ''اَنْدَادًا'' کے لیے صفت بن رہا ہے۔ ''کَ'' جارہ ہے ''حُبِّ'' مجرور ہے' لفظ ''اللّٰہِ'' مضاف الیہ ہے۔ ''واؤ'' استیناف کے لیے ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ'' اسم موصول مبتدأ ہے۔ ''اٰمَنُوْا'' فعل ماضی ہے۔ ''واؤ'' ضمیر بارز متصل اس کا فاعل ہے۔ ''اَشَدُّ'' اس کی خبر ہے۔ ''حُبًّا'' تمیز ہے۔ ''لِلّٰہِ'' جار مجرور ہو کر متعلق تمیز ہوا۔ ''واؤ'' استیناف کا ہے۔ ''لَوْ'' حرف شرط غیر جازم ہے۔ ''یَرٰی'' فعل مضارع ''اَلَّذِیْنَ'' اسم موصول ''ظَلَمُوْا'' فعل با فاعل ہو کر صلہ ہوا۔ موصول صلہ مل کر فاعل ہوا ''یَرٰی'' کا۔ ''اِذْ'' حرف زمان ہے' محل نصب میں ہے اور ''حِیْنَ'' کے معنی میں ہے۔ ''یَرَوْنَ'' فعل مضارع با فاعل ہے ''اَلْعَذَابَ'' اس کا مفعول ہے۔ یہ جملہ خبریہ ہو کر ''اِذْ'' کا مضاف الیہ ہوا۔ اور ''اِذْ'' اپنے مضاف الیہ کے ساتھ مل کر بتاویل مصدر ''یَرٰی'' کا مفعول فیہ ہوا۔ پورا جملہ ''اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ'' شرط ہے اور جواب شرط یہاں پر محذوف ہے اور وہ ''لَعَلِمُوْا'' ہے۔ ''اَنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ہے۔ ''اَلْقُوَّۃَ'' اسم ''اَنَّ'' ہے۔ ''لِلّٰہِ'' جار مجرور متعلق خبر محذوف ہے۔ ''جَمِیْعًا'' حال ہے۔ ''اَنَّ'' اپنے اسم و خبر محذوف کے ساتھ مل کر بتاویل مصدر مفعول ہوا۔ ''واؤ'' عاطفہ ''اَنَّ'' حرف مشبہ بالفعل' لفظ ''اللّٰہَ'' اسم ''اَنَّ'' ہے۔ ''شَدِیْدُ الْعَذَابِ'' خبر ''اَنَّ'' ہے۔

ترجمہ:

وَمِنَ النَّاسِ : اور لوگوں میں وہ بھی ہیں	مَنْ : جو
یَتَّخِذُ : بناتے ہیں	مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ : اللہ کے علاوہ (کچھ) کو

اَنْدَادًا :(اس کا) ہم پلہ	یُحِبُّوْنَھُمْ :وہ لوگ محبت کرتے ہیں ان سے
کَحُبِّ اللّٰہِ :اللہ کی محبت کی مانند	وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا :اور جو لوگ ایمان لائے وہ
اَشَدُّ :زیادہ شدید ہیں	حُبًّا لِّلّٰہِ :اللہ کے لیے محبت کے لحاظ سے
وَلَوْ یَرَی :اور کاش تصور کریں	الَّذِیْنَ :وہ لوگ جنہوں نے
ظَلَمُوْا :ظلم کیا	اِذْ یَرَوْنَ :(اُس وقت کا) جب وہ لوگ دیکھیں گے
الْعَذَابَ :عذاب کو	اَنَّ الْقُوَّۃَ :(اور دیکھیں گے) کہ ساری قوت
لِلّٰہِ :اللہ کے لیے ہے	جَمِیْعًا :سب کی سب
وَّاَنَّ اللّٰہَ :اور (دیکھیں گے) کہ اللہ	شَدِیْدُ الْعَذَابِ :عذاب کا شدید ہے

نوٹ (۱) : دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجنے سے پہلے انسان کو جو کچھ سکھایا یا پڑھایا جاتا ہے' یعنی جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا جاتا ہے' اس میں اللہ کی محبت بھی شامل ہے۔ لیکن دنیا میں آنے کے بعد کچھ لوگ مادی ذرائع اور وسائل کو یعنی پیسے اور زندہ و مردہ ہستیوں کو ہی اپنا حاجت روا' مشکل کشا اور اَن داتا فرض کر بیٹھتے ہیں تو محبت کا یہ جذبہ ان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' جو اس کا مذموم استعمال ہے۔ لیکن کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کچھ کو تجربہ اور کچھ کو مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ جب سارے آسرے وسیلے جواب دے دیتے ہیں' اُمیدیں دم توڑ جاتی ہیں' اس وقت جس طرح بلبلا کر انسان اللہ کو پکارتا ہے تو وہ درحقیقت اس کی فطرت کا مظہر ہے۔ جگر مرحوم کو پتا نہیں تجربہ ہوا تھا یا مشاہدہ' لیکن اس کیفیت کو انہوں نے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ ؎

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

واضح رہے کہ مادی اسباب کے استعمال کی ممانعت نہیں ہے' بلکہ تاکید ہے' کیونکہ اللہ نے ہمارے لیے ان کو مسخر کیا ہے (۳۱:۲۰)۔ اور انہیں دنیا کی زندگی کا سامان بنایا ہے۔ (۲۸:۶۰)۔ ان میں عام انسان اور زندہ ہستیاں بھی شامل ہیں (۴۳:۳۲)۔ لیکن ان کو

استعمال کرتے وقت دو باتوں میں ہمارا امتحان ہے۔ اوّلاً یہ کہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ان کو استعمال کرنا ہے۔ ثانیاً یہ کہ تکیہ اور بھروسہ یعنی توکل اسباب پر نہیں کرنا ہے' ورنہ پھر وہی ہوگا جس کی اس آیت میں نشاندہی کی گئی ہے۔ البتہ اگر مادی اسباب کو ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جائے اور نتیجہ کے لیے توکل اللہ پر ہو تو پھر محسن سے محبت کے فطری جذبے کا رُخ محسنِ حقیقی ہی کی جانب رہتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔ دیگر فوائد کے ساتھ اس کا ایک نقد فائدہ یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اپنے داخلی خلفشار سے محفوظ و مامون رہتی ہے اور اَلنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ کی جانب اس کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

آیت ۱۶۶

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝﴾

س ب ب

سَبَّ (ن) سَبًّا: (۱) رسّی کاٹنا' تعلقات کے بندھن کاٹنا۔ (۲) گالی دینا (کیونکہ اس سے تعلقات منقطع ہوتے ہیں)۔ ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ﴾ (الانعام:۱۰۸) ''اور تم لوگ گالی مت دو ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اللہ کے علاوہ کسی کو' تو وہ لوگ برا کہیں گے اللہ کو۔''

سَبَبٌ ج اَسْبَابٌ (اسم ذات): ایسی رسّی جس سے درخت پر چڑھا اور اترا جاتا ہے۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے: (۱) رسّی (۲) بندھن' تعلقات (۳) ذریعۂ سامان۔ ﴿فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ﴾ (الحج:۱۵) ''تو اسے چاہیے کہ وہ تان لے کوئی رسّی آسمان کی طرف۔'' ﴿وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝﴾ (الکہف) ''اور ہم نے دیا اس کو ہر چیز میں سے بطور سامان کے''۔ ''تعلقات'' کے مفہوم کے لیے آیت زیرِ مطالعہ دیکھیں۔

ترکیب: ''تَبَرَّاَ'' کا فاعل ''اَلَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا'' ہے' جبکہ ''مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا'' اس کا مفعول ہے۔ ''رَاَوُا'' کا فاعل اس میں شامل ''هُمْ'' کی ضمیر ہے جو گزشتہ جملہ کے فاعل اور مفعول دونوں کے لیے ہے۔ ''اَلْعَذَابَ'' اس کا مفعول ہے۔ ''تَقَطَّعَتْ'' کا فاعل ''اَلْاَسْبَابُ'' ہے' اس پر لامِ جنس ہے۔ اور چونکہ یہ غیر عاقل کی جمع مکسر ہے اس لیے فعل

واحد مؤنث آیا ہے۔ یہاں قیامت کا ذکر ہے اس لیے ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔

ترجمہ:

اِذْ تَبَرَّاَ: جب اظہارِ بیزاری کریں گے	الَّذِيْنَ :وہ لوگ جن کی
اتُّبِعُوْا: پیروی کی گئی	مِنَ الَّذِيْنَ :ان لوگوں سے جنہوں نے
اتَّبَعُوْا : پیروی کی	وَرَاَوُا :اور وہ لوگ دیکھیں گے
الْعَذَابَ :عذاب کو	وَتَقَطَّعَتْ :اور کٹ جائیں گے
بِهِمُ: ان کے	الْاَسْبَابُ: سارے بندھن

آیت ۱۶۷

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾

ك ر ر

كَرَّ (ن) كُرُوْرًا :لوٹنا' مڑنا۔

كَرًّا : لوٹانا' موڑنا۔

كَرَّةٌ : ایک مرتبہ لوٹنا یا لوٹایا جانا' یعنی دوسری باری' دوسری اننگ۔آیت زیرِ مطالعہ

ح س ر

حَسَرَ (ض) حَسْرًا: تھکانا' غمگین کرنا۔

حَسِرَ (س) حَسَرًا: تھکنا' غمگین ہونا۔

حَسْرَةٌ ج حَسَرَاتٌ (اسم ذات): تأسف' حسرت۔﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾ (آل عمران:١٥٦) ''تاکہ بنائے اللہ اس کو حسرت ان کے دلوں میں۔''

حَسِيْرٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): غم زدہ' ناکام۔ ﴿يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴾ (الملك:٤) ''لوٹے گی تیری طرف نگاہ تھکی ہوئی اور وہ ناکام ہوگی''۔

مَحْسُوْرٌ (مَفْعُوْلٌ کے وزن پر صفت) : تھکایا ہوا' تھکا ہارا۔ ﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴾ (بنی اسراء یل) ''کہ پھر تو بیٹھے ملامت زدہ تھکا ہارا ہوتے ہوئے۔''

اِسْتَحْسَرَ (استفعال) اِسْتِحْسَارًا: تھکاوٹ محسوس کرنا' سستی کرنا' کاہلی کرنا۔

﴿لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء) ''وہ لوگ استکبار نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہ ہی سستی کرتے ہیں۔''

ترکیب : ''لَوْاَنَّ'' کا ''لَوْ'' تمنی ہے۔ ''کَرَّۃً'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور ''اَنَّ'' کا اسم ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے اور ''لَنَا'' قائم مقام خبر مقدم۔ ''فَنَتَبَرَّاَ'' میں مضارع منصوب آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ''لام کَیْ'' یا ''لِاَنْ'' محذوف ہے۔ ''یُرِیْ'' کا فاعل ''اَللّٰہُ'' ہے' اس کا مفعول اوّل ''ھُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''قَالَ الَّذِیْنَ'' کے لیے ہے جبکہ ''اَعْمَالَھُمْ'' اس کا مفعول ثانی ہے اور ''حَسَرٰتٍ'' حال ہونے کی وجہ سے نصب میں آیا ہے۔

ترجمہ:

وَقَالَ : اور کہیں گے	الَّذِیْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
اتَّبَعُوْا : پیروی کی	لَوْ اَنَّ : کاش کہ
لَنَا : ہمارے لیے ہوتی	کَرَّۃً : کوئی ایک اور باری
فَنَتَبَرَّاَ : تا کہ ہم اظہار بیزاری کرتے	مِنْھُمْ : ان سے
کَمَا : جیسے کہ	تَبَرَّءُ وْا : انہوں نے اظہار بیزاری کیا
مِنَّا : ہم سے	کَذٰلِکَ : اس طرح
یُرِیْھِمُ : دکھائے گا اُن کو	اللّٰہُ : اللہ
اَعْمَالَھُمْ : ان کے اعمال	حَسَرٰتٍ : حسرتیں ہوتے ہوئے
عَلَیْھِمْ : ان پر	وَمَا ھُمْ : اور نہیں وہ لوگ
بِخٰرِجِیْنَ : نکلنے والے	مِنَ النَّارِ : آگ سے

نوٹ (۱) : سورۃ البقرۃ کی آیت ۴۸ اور ۱۲۳ میں اصولی بات بیان کی گئی ہے کہ کوئی جان کسی جان کے کام نہیں آئے گی۔ اسی اصول کو دوسرے الفاظ میں پانچ مقامات پر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ (الانعام: ۱۶۴' بنی اسرائیل: ۱۵' فاطر: ۱۸' الزمر: ۷' النجم: ۳۸)۔ اس اصول کے ایک پہلو کا نقشہ آیت زیر مطالعہ اور اس سے پچھلی آیت میں کھینچا گیا ہے۔ جب کسی کا کوئی باہم مشورہ یا فتویٰ غلط ثابت ہوگا اور ان پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے والوں کو پکڑا جائے گا یا کسی پیر صاحب کی غلطی پر ان کے مرید پکڑے جائیں گے' تو پھر اُس وقت کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔

سلسلۂ نباتاتِ قرآن (قسط 10)

نخل

Date-Palm

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

عربی اور عبرانی: تمر۔ نخل
فارسی، اُردو: خُرما
جرمن: Dattelpalm
ہندی، اردو: کھجور

فرانسیسی: Datte
سنسکرت، بنگلہ: کھرجور
انگریزی: Date-Palm

قرآن مجید میں اس مذہبی پھل کا ذکر بیس مرتبہ آیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱) ﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ.....﴾ (البقرۃ:۲٦٦)
''کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا.....''

۲) ﴿.....وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ.....﴾ (الانعام:۹۹)
''.....اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے (پیدا کیے) جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں.....''

۳) ﴿.....وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ.....﴾ (الانعام:۱٤۱)
''.....اور (اللہ ہی نے) نخلستان اور کھیتیاں (پیدا کیں) جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں.....''

۴) ﴿.....وَنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ.....﴾ (الرعد:٤)
''.....اور کھجور کے درخت ہیں جن میں کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے.....''

۵) ﴿یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾
(النحل:۱۱)

''وہ اس (پانی) کے ذریعے سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے''۔

۶) ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾

(النحل:٦٧)

''اور کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی (ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں) جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی''۔

۷) ﴿اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا﴾

(بنی اسراء یل)

''یا آپ (ﷺ) کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور آپ اس میں نہریں رواں کر دیں''۔

۸) ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا﴾ (الکھف)

''اور (اے نبیؐ!) ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے' ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی''۔

۹) ﴿فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (مریم:٢٣)

''پھر زچگی کی تکلیف نے اسے (مریم علیہا السلام کو) ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا''۔

۱۰) ﴿وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ (مریم)

''اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا' تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی''۔

۱۱) ﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾

(طٰہٰ:٧١)

''(فرعون نے ایمان لانے والے جادوگروں سے کہا) پس اب میں لازماً تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں''۔

۱۲) ﴿فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۖ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''پھر اِس (پانی) کے ذریعے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے' تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو''۔

۱۳)﴿وَزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ﴾ (الشُّعراء)

''اور ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں''۔

۱۴)﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ﴾ (یٰسٓ)

''اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے''۔

۱۵)﴿وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾ (قٓ)

''اور (ہم نے اس مبارک پانی کے ذریعے) بلند و بالا کھجور کے درخت (اگا دیے) جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہہ بہ تہہ لگتے ہیں''۔

۱۶)﴿تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ (القمر)

''وہ (طوفانی ہوا) لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں''۔

۱۷)﴿فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ (الرحمٰن)

''اُن (دو باغوں) میں بکثرت پھل اور کھجور اور انار ہیں''۔

۱۸)﴿.....فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (الحاقّة)

''.....تو تم (وہاں ہوتے تو) ان لوگوں کو دیکھتے کہ وہ اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں''۔

۱۹)﴿وَزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا﴾ (عبس)

''اور (ہم نے زمین کو پھاڑ کر اس کے اندر سے) زیتون اور کھجوریں (اگائیں)''۔

اس پھل کو ہم نے ''مذہبی'' اس لیے کہا کہ تینوں بڑے الہامی مذاہب کا آغاز کھجوروں کی سرزمین (مشرقِ وسطیٰ) سے ہوا۔ ان کے ماننے والے آپس میں شدید اختلافات کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بطور ''ابوالانبیاء'' حیثیت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اُر (عراق) میں پیدا ہوئے تھے جہاں کھجوروں کی اکثریت تھی۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اُر سے ہجرت کی اور مشرقِ وسطیٰ کے مختلف علاقوں سے گھومتے' گزرتے بالآخر فلسطین کے ایک

مقام پر آباد ہو گئے تو اُن کے خشک راشن میں کھجوریں ہوتی تھیں۔

کھجور قدیم دیومالائی رسوم میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بابل اور سمیریا میں مذہبی رسوم کے طور پر بادشاہوں کے تخت کھجور کے پتوں سے سجائے جاتے تھے۔ اہلِ بابل کی تو باقاعدہ ایک کھجور دیوی تھی، جس کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ دیوی عورت کی شکل میں تھی اور اِس کے دو پَر تھے، لیکن یہ پَر کھجور کے پتوں کے تھے۔ مادہ کھجور کی زیرگی کا عمل ایک مذہبی رسم کے طور پر سرانجام دیا جاتا تھا۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو قدیم تحریریں دریافت ہوئی ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے کہ ملک شام کے قریب فونیقیا میں کھجور کی ایک ''مقدس درخت'' کے طور پر پرستش ہوتی تھی۔ اُن علاقوں میں کھجور کا درخت ''شجرِ حیات'' کا مرتبہ رکھتا تھا۔ قدیم نینوا کے شاہی محلات میں فن کاروں اور مصوروں کے فن کا شاہکار وہ تصاویر خیال کی جاتی تھیں جن میں کھجور کو مختلف انداز اور زاویوں میں دکھایا گیا تھا۔ شہر کے دروازوں اور معبدوں میں بھی کھجور کی نقاشی کی جاتی تھی۔ اسی طرح کھجور سے کچھ توہمات بھی وابستہ کر دیے گئے تھے۔ مثلاً اشوریہ کے لوگ دو کھڑی کھجوروں کے درمیان سے گزرنے کو منحوس خیال کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک عقیدہ یہ تھا کہ مہینے کے بعض خاص دنوں میں کھجور ہرگز نہیں کھانی چاہیے، ورنہ بدقسمتی کا سامنا کرنا ہوگا۔

مصریات کے ماہرین نے اہرام اور دیگر آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا ہے کہ مصر میں کھجور کئی ہزار سال سے موجود ہے۔ فرعون رعمسیس سوم کے احکام کے مطابق مذہبی قربانیوں میں ایک خاص مقدار میں کھجوریں شامل ہوتی تھیں۔

قرآن مجید میں اُن جادوگروں کا ذکر آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے معجزے کو غالب دیکھ کر اللہ واحد پر ایمان لے آئے تھے۔ فرعون اُن کے ایمان لانے پر آپے سے باہر ہو گیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

> ''سو میں لازماً تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں مخالف سمتوں میں (ایک طرف کا ہاتھ، ایک طرف کا پاؤں) اور تم سب کو کھجور کے تنوں پر سولی پر لٹکواتا ہوں''۔ (طٰہٰ:۷۱)

یہ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کا دَور تھا۔ گویا قرآن مجید کی شہادت کے مطابق مصر میں کھجور ساڑھے تین، چار ہزار سال قبل بکثرت موجود تھی۔ اس سے بھی زیادہ قدیم جزیرہ

نمائے عرب میں ایک قدآور قوم ''عاد'' بستی تھی۔ اس قوم نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت رد کر دی تو اُن پر ہلاکت کے لیے تیز و تند ہوا بھیجی گئی جو قومِ عاد کو ''اس طرح اُکھاڑ اُکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اُکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں''۔ (القمر: ۲۰) ثابت ہوا کہ ہزاروں سال پہلے قومِ عاد بھی کھجوروں کے علاقے میں آباد تھی۔

الہامی مذاہب اور ''مقدس کھجور''

یہودیوں کی مذہبی کتاب ''تالمود'' میں کھجور اور اس کی کاشت کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک کھجور سات مقدس پھلوں میں سے ایک ہے۔ یہودی اپنے ایک مذہبی تہوار کے موقع پر کھجور کے پتوں کے ٹکڑے اٹھا کر چلتے ہیں۔ ہیکل سلیمانی میں تصویروں کا سب سے بڑا موضوع کھجور ہی تھی۔ ستونوں والی عمارات بنانے کا رواج بھی کھجور کے تنوں کے استعمال سے ہوا۔ تورات میں کھجور کا ذکر چند مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً کتاب ''قضاۃ'' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سسرال کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ''وہ کھجوروں کے شہر کے رہنے والے تھے''۔ اسی کتاب کے تیسرے باب میں کھجوروں کے شہر میں یہودیوں کی شکست کا ذکر ہے' جبکہ اگلے باب میں کاہنہ دبورہ کا حال بیان ہوا ہے جو ہمیشہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھی رہتی تھی اور پیشین گوئیوں کے علاوہ بنی اسرائیل کو آنے والے حادثات سے بھی خبردار کرتی رہتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو پیدائش ہی کھجور کے ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ اس بنا پر عیسائیوں کے نزدیک کھجور ایک مقدس و متبرک درخت ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے سلسلے میں سورۂ مریم کی آیات ۲۳ تا ۲۵ میں یوں آیا ہے:

> ''پھر زچگی کی تکلیف نے اسے (مریم علیہا السلام کو) ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا' اور وہ کہنے لگی: کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔ اور اُس وقت اُس (کھجور کے درخت) کے نیچے کی جانب سے فرشتے نے اُن کو آواز دی کہ غمگین نہ ہو' تمہارے پروردگار نے تمہارے پاؤں تلے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ' تم پر تازہ تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی''۔

کھجور کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا کیا کہ اُس کے سائے میں اپنے وقت کی سب سے

نیک اور پاک دامن عورت نے ایک جلیل القدر پیغمبر کو جنم دیا۔ کھجور کے ساتھ اسی پیدائشی تعلق کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک خطاب ''ذوالنخلہ'' (کھجور والا) بھی لوگوں نے دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے زچگی کی تکلیف میں چھوہاروں کا استعمال ایک معمول ہے۔ کم از کم مسلمان عورتوں میں اس کا رواج ہے۔ عیسائیوں کا ایک تہوار ''پام سنڈے'' کہلاتا ہے۔ اس تہوار کی مذہبی رسوم میں کھجور کے پتے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یورپ' خصوصاً اٹلی اور روم میں مختلف مذہبی تہواروں میں استعمال کے لیے بھاری مقدار میں کھجوروں کے پتے شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ سے درآمد کیے جاتے ہیں۔

کھجور اور اسلام

تاہم کھجور کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور اسلام نے دیا ہے۔ قرآن مجید کی سترہ سورتوں میں بیس مقامات پر کھجور (نخل) کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس کے علاوہ چند مقامات پر کھجور کا نام لیے بغیر اس کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مقدس درخت کے لیے اہم ترین خراجِ تحسین اس آیت میں ہے جس میں کلمۂ طیبہ کو کھجور جیسے بلند قامت اور خوبصورت درخت کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴' ۲۵ یہ ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کلمۂ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے' جیسے پاکیزہ درخت' جس کی جڑ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ بھرپور دیتا ہو' اور اللہ لوگوں کے لیے ایسی تمثیلیں بیان کرتا ہے' تاکہ وہ نصیحت پکڑیں''۔

اس مثال سے ایک بات یہ واضح ہوتی ہے کہ کھجور بہت پاکیزہ درخت ہے' کلمۂ طیبہ کی طرح پاکیزہ۔ کھجور کی جڑیں زمین میں بہت گہرائی تک جاتی ہیں اور یہ درخت آندھی اور طوفان وغیرہ کا خوب مقابلہ کرتا ہے۔ قرآن مجید اسی حقیقت کی تصدیق کر رہا ہے۔ آسمان میں اس کی شاخوں کا جانا اس کی جمالیاتی شان و شوکت کا مظہر ہے۔ دنیا میں ایسا کون سا

درخت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ایسی شان بیان کی ہو! اسی بنا پر انسانی تاریخ میں کھجور کو ہمیشہ ''شجرِ جنت'' کہا گیا ہے۔ رومی شہنشاہ کو لوگوں نے بتایا کہ عرب میں ایک عجیب و غریب درخت ہوتا ہے جس کی خصوصیات دوسرے درختوں سے مختلف ہیں' اور جب اِس کے سیپ کھلتے ہیں تو اُن میں سے موتیوں جیسے گول دانے نکلتے ہیں' جو سرخ یا زرد ہو جاتے ہیں۔ رومی شہنشاہ نے اپنے تجسس کی تصدیق کے لیے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق ؓ کو خط لکھا اور کہا کہ شاید یہ کوئی ''شجرِ جنت'' ہوگا۔ حضرت عمر ؓ نے اپنے جواب میں جہاں رومی حکمران کو ایمان لانے کی دعوت دی' وہاں کھجور کی بطور ''شجرِ حیات'' حیثیت کی بھی تصدیق کی۔ کھجور کے متعلق رومی شہنشاہ کا خط اور حضرت عمر فاروق ؓ کا جواب دونوں محفوظ ہیں۔

آنحضور ﷺ کی کھجور کے ساتھ محبت کے کئی واقعات محفوظ ہیں۔ مکہ مکرمہ میں کھجوریں پیدا نہیں ہوتی تھیں' کیونکہ یہ وادیٔ غیر ذی زرع تھی۔ تاہم وہاں کھجوریں دوسرے علاقوں سے آتی تھیں' تازہ بھی اور خشک بھی۔ حضور ﷺ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے پہلے کھجوروں سے خوب مانوس تھے۔ مدینہ منورہ کو ''کھجوروں کی بستی'' بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت سلمان فارسی ؓ کو خوابوں میں (اسلام کی طرف رہنمائی کے لیے) کھجوروں کی بستی دکھائی گئی تھی۔ بطور غذا کھجور کی افادیت کے متعلق کئی احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث نبویؐ ہے جس کے مطابق کھجور کے ساتھ انسان کا خلقی رشتہ ہے' یعنی کھجور کی تخلیق اُس مٹی سے ہوئی جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد بچ گئی تھی۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی تھی کہ وہ روزہ کھجور سے افطار کیا کریں۔ صحابیٔ رسول حضرت سلمان بن عامر ؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

> ''جو شخص تم میں سے روزہ رکھے وہ کھجور سے افطار کرے' اس لیے کہ کھجور برکت کا سبب ہے۔ اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کرے' اس لیے کہ پانی پاک کرنے والا ہے''۔ (ترمذی' احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ)

اسی طرح حضرت انس ؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ افطار کے لیے تازہ کھجوروں کو ترجیح دیتے تھے' اور اگر تازہ کھجوروں کا موسم نہ ہوتا تو آپؐ خشک کھجوروں سے روزہ کھولتے تھے۔ چنانچہ پوری دنیائے اسلام میں موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک رمضان میں لوگ ترجیحاً کھجور سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ لاکھوں ٹن کھجوریں ایک مہینے میں استعمال ہو جاتی ہیں۔ مسلمان اس مبارک مہینے میں ایک دوسرے کو کھجور بطور تحفہ بھی بھیجتے ہیں۔ سعودی عرب

میں ہر سال رمضان کے مہینے میں لاکھوں مسلمان عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ وہاں مسجد حرام اور مسجد نبویؐ میں مغرب کے وقت سینکڑوں من تازہ کھجور روزہ داروں کو نیک سرشت مقامی عربوں کی طرف سے مفت تقسیم کی جاتی ہے' خواہ تازہ کھجور کا موسم ہو یا نہ ہو۔ سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک میں کھجور کو سارا سال تازہ حالت میں رکھنے کے لیے خاص درجۂ حرارت کے کولڈ سٹوریج میں رکھا جاتا ہے۔

جب روزے ختم ہوتے ہیں تو عید الفطر آتی ہے۔ اس موقع پر اسلامی ملکوں میں جو میٹھے پکوان تیار کیے جاتے ہیں' اُن میں چھوہارے' کھجوریں' کھجوروں کا شہد اور کھجوروں کا حلوہ کسی نہ کسی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمانانِ پاک و ہند میں شیر خُرما پکانے کا عام رواج ہے۔ اس کے علاوہ سویوں میں بھی چھوہارے ڈالے جاتے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب تک حضور ﷺ کچھ کھجوریں نہ کھا لیتے' عید الفطر کی نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نہیں نکلتے تھے اور اس موقع پر آپؐ ہمیشہ طاق تعداد میں کھجوریں تناول فرماتے۔ نوزائیدہ مسلمان بچوں کو جو گھٹی باپ یا دادا یا نانا وغیرہ کی طرف سے دی جاتی ہے' اُس میں سنتِ رسولؐ کے مطابق کھجور کا کچھ حصہ عام طور پر شامل ہوتا ہے۔

کھجوریں فروخت کرنے والے دکان داروں کے ہاں لکھا ہوتا ہے: ''کھجور کھانا سنتِ رسولؐ ہے''۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ آنحضور ﷺ کی ایک حدیث ہے: ''جس گھر میں کھجوریں نہ ہوں اُس کے آدمی بھوکے ہیں''۔ آپؐ نے دو یا تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے (صحیح مسلم)۔ اس حدیث کی رُو سے لازم آتا ہے کہ ہر مسلمان گھرانے میں کچھ نہ کچھ کھجوریں ہمیشہ موجود ہونی چاہئیں۔ حضور ﷺ کو کھجور واقعی پسند تھی۔ یہ واقعہ محفوظ ہے کہ ایک دفعہ آپؐ کے پاس پرانی کھجوریں لائی گئیں' جن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ آپؐ ان کھجوروں کو انگلیوں سے چیر کر دیکھتے' کیڑے نکال کر پھینک دیتے اور صاف کر کے استعمال کرتے تھے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ کھجور روٹی کے ساتھ ایک سالن کی طرح ہے۔ حضور ﷺ کے لیے گھر میں نبیذ تیار کی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ چمڑے کی مشک میں پانی کے ساتھ کچھ کھجوریں ڈال دی جاتی تھیں۔ یہ رات بھر پڑی رہتیں۔ صبح کو اور دن بھر حضور ﷺ اس میں سے پیتے رہتے۔ حضور ﷺ نے کھجوروں کے ساتھ خربوزہ' ککڑی' لوکی' روٹی اور مکھن کا استعمال کیا ہے۔ ''عجوہ'' کھجور کا نام تو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے حضور ﷺ کے ساتھ نسبت کی وجہ سے مشہور ہے۔ آج یہ مدینہ منورہ کی سب سے مہنگی ورائٹی ہے۔ اس شہرت و مقبولیت

(باقی صفحہ 63 پر)

قرآن مجید

کلامِ الٰہی یا عبارتِ کلامِ الٰہی؟

تحقیق و تحریر: حافظ محمد زبیر ☆

قرآن کا لغوی مفہوم

''قُرْآنٌ'' دراصل ''قَرَأَ، یَقْرَأُ'' سے نکلا ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ ''پڑھنے'' کے معنی میں اس لیے مستعمل ہوگیا کہ اس میں کلمات اور حروف کو جمع کیا جاتا ہے۔(۱) لغوی اعتبار سے لفظ ''قرآن'' مصدر ہے اور ''قِرَاءَۃ'' کے مترادف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ﴾ (القیامۃ)

''بے شک ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھنا۔ پس جب ہم اس کو پڑھ دیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں''۔

بعد میں اسی مصدر سے مفعولی معنی مراد لیتے ہوئے اس کا اطلاق کلام اللہ پر کیا جانے لگا۔ گویا کہ قرآن کا مفہوم ہوگا ''پڑھی گئی کتاب' یا پڑھا گیا کلام''۔(۲)

قرآن کو ''الفرقان'' بھی کہا جاتا ہے' کیونکہ یہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا کلام ہے۔ کلام اللہ کے یہ دو نام بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴾ (الفرقان)

''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتاری تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو''۔

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

(۱) المفردات' امام راغب اصفہانیؒ' ص ۴۱۱۔

(۲) مناہل العرفان' علامہ زرقانی' ج ۱' ص ۴۔

قرآن کی اصطلاحی تعریف

علمائے اصولیین کے نزدیک قرآن کی اصطلاحی تعریف درج ذیل ہے:

اَلْقُرْآنُ هُوَ الْكِتَابُ الْمُنَزَّلُ عَلَى الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَكْتُوْبُ فِي الْمَصَاحِفِ الْمَنْقُوْلُ اِلَيْنَا عَنْهُ نَقْلًا مُتَوَاتِرًا بِلَاشُبْهَةَ (۱)

''قرآن مجید وہ کتاب ہے جو (اللہ کی طرف سے) اللہ کے رسول ﷺ پر نازل کی گئی ہے' مصاحف میں لکھی ہوئی ہے اور ہم تک بغیر کسی شک وشبہ کے آپ کی طرف سے نقل در نقل ہو کر پہنچی ہے''۔

کلام الٰہی کے بعض حصے پر لفظ ''قرآن'' کا اطلاق

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کلام الٰہی کے بعض حصہ یا کُل' دونوں پر لفظ ''قرآن'' کا اطلاق درست ہے۔ پس جس نے منزل شدہ سارا کلام الٰہی پڑھا اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ اس نے قرآن پڑھا اور جس نے اس میں ایک آیت بھی پڑھی اس کے بارے میں بھی کہا جائے گا کہ اس نے قرآن پڑھا۔

بعض علماء کی رائے میں ''القرآن'' سے مراد پورا قرآن ہے جبکہ ''قرآن'' سے مراد قرآن کا بعض حصہ ہے۔

نزول قرآن

لفظ ''نُزُوْل'' ''نَزَلَ' يَنْزِلُ'' سے مصدر ہے اور اس کا لغوی معنی ''کسی جگہ اترنا یا پڑاؤ ڈالنا'' ہے۔ باب افعال میں جا کر یہ متعدی ہو جاتا ہے اور اس کا معنی ''کسی جگہ کسی کو اُتارنا یا ٹھہرانا'' ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝﴾ (المؤمنون)

''اے میرے ربّ! مجھے بابرکت جگہ پر اتار اور تو سب سے بہتر جگہ دینے والا ہے''۔

تنزّلاتِ قرآن

عام طور پر مفسرین نے قرآن کریم کے دو مرتبہ نزول کا تذکرہ کیا ہے' لیکن اس معاملے میں ہمارے نزدیک صحیح رائے علامہ زرقانیؒ کی ہے جنہوں نے اپنی کتاب ''مناہل العرفان''

(۱) جامع الاصول از پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن' ترجمہ الوحید از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان' ص ۱۱۷

میں قرآن کے تین مرتبہ نزول کا تذکرہ فرمایا ہے:

۱) پہلی مرتبہ قرآن کا نزول لوحِ محفوظ میں ہوا۔ اس کی دلیل یہ آیۂ مبارکہ ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج)

''بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے' اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے''۔

الفاظ کے اطلاق سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ لوحِ محفوظ میں قرآن کا نزول یک بارگی تھا' نہ کہ آہستہ آہستہ۔ اور لوحِ محفوظ میں قرآن ایسے طریقے اور کیفیت سے موجود ہے جس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

۲) دوسری مرتبہ قرآن کا نزول سمائے دنیا میں ''بیت العزۃ'' پر ہوا۔ اس کی دلیل درج ذیل آیاتِ مبارکہ ہیں:

﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان:۳)

''بے شک ہم نے اس قرآن مجید کو ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔''

﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ (القدر)

''بے شک ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔''

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کو نازل کیا گیا۔''

اِن آیاتِ ثلاثہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کا نزول ایک ہی رات میں ہوا۔ سورۃ الدخان کی آیت ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ جس رات میں قرآن کا نزول ہوا وہ ایک بابرکت رات تھی۔ سورۃ القدر میں اس رات کو ''لیلۃ القدر'' کا نام دیا گیا اور سورۃ البقرۃ میں اسے رمضان کی راتوں میں سے ایک رات قرار دیا گیا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ پر قرآن کا نزول ایک خاص اور متعین مدت میں ہوا لہٰذا ان آیات سے مراد وہ نزول نہیں ہے جو کہ آپؐ پر تقریباً تیئیس برس میں ہوا' بلکہ یہ اس کے علاوہ ایک نزول ہے جس کی تصدیق ان آیات کے علاوہ بہت سی اخبارِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے' جن میں سے ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اِلٰى سَمَآءِ الدُّنْيَا لَيْلَةَ الْقَدْرِ ثُمَّ اُنْزِلَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ عِشْرِيْنَ سَنَةً

''قرآن کو قدر کی رات سمائے دنیا پر یکبارگی نازل کیا گیا' پھر اس کے بعد بیس سال

کے عرصے میں اس کا (آہستہ آہستہ) نزول ہوا۔''

۳) تیسری مرتبہ قرآن کا نزول حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطے سے وقفے وقفے سے نبی اکرم ﷺ کے دل پر ہوا۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیۂ مبارکہ ہے:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الشعراء)

''اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اُتری ہے' تاکہ تُو اُن لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں' (اور یہ اترا ہے) صاف صاف عربی زبان میں۔''

ہمارے پاس موجود قرآن کی اصل حیثیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کلام کو لے کر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئے یہ وہی کلام ہے جو کہ مصاحف دُنیویہ میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ حقیقی اور معجزہ ہیں۔ یہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کی انشاء یا ترتیب میں حضرت جبرئیلؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا کوئی دخل نہیں' بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہی ان کو پہلی مرتبہ مرتب کیا۔ اس وجہ سے ان الفاظ کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہو گی نہ کہ آپ ﷺ یا حضرت جبرئیلؑ اور آپؐ کے بعد قیامت تک آنے والے انسانوں کی طرف۔ کیونکہ کلام کی نسبت عموماً اس کی طرف ہوتی ہے جس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا یا اپنے نفس میں مرتب کیا۔ جیسا کہ اگر آج ہم میں کوئی شخص اپنی تقریر میں قائداعظم کا کوئی قول یا علامہ اقبال کا شعر نقل کرتا ہے تو وہ کلام اقبال یا فرمانِ قائد کہلائے گا نہ کہ اُس شخص کا ذاتی کلام۔ اسی طرح اگر آج ہم میں سے کوئی قرآن کی تلاوت کرتا ہے یا اس کی کتابت کرتا ہے تو دراصل وہ کلام اللہ ہی کی تلاوت یا کتابت کرتا ہے۔ ''شرح عقیدہ طحاویہ'' جو کہ اہل سنت والجماعت اور علمائے احناف کے عقائد کی مسلم ومستند ترین کتاب ہے' اس میں اس مسئلہ پر تفصیلاً بحث موجود ہے۔ ذیل میں ہم اس کا خلاصہ نقل کیے دیتے ہیں۔

اہل سنت کا موقف بیان کرتے ہوئے علامہ ابن ابی العز حنفی لکھتے ہیں:

وَبِالْجُمْلَةِ فَاَهْلُ السُّنَّةِ كُلُّهُمْ مِنْ اَهْلِ الْمَذَاهِبِ الْاَرْبَعَةِ وَغَيْرِهِمْ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى اَنَّ كَلَامَ اللّٰهِ غَيْرُ مَخْلُوْقٍ وَلٰكِنْ بَعْدَ ذٰلِكَ تَنَازَعَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ فِيْ اَنَّ كَلَامَ اللّٰهِ هَلْ هُوَ مَعْنًى وَاحِدٌ بِالذَّاتِ اَوْ

اَنَّهٗ حُرُوْفٌ وَاَصْوَاتٌ تَكَلَّمَ اللّٰهُ بِهَا بَعْدَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ مُتَكَلِّمًا، اَوْ اَنَّهٗ لَمْ يَزَلْ مُتَكَلِّمًا اِذَا شَاءَ وَمَتٰى شَاءَ وَاَنَّ نَوْعَ الْكَلَامِ قَدِيْمٌ (۱)

''مذاہب اربعہ کے حاملین اہل سنت' متقدمین اور متاخرین' تمام کے تمام اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔ لیکن متاخرین کا بعد میں اس بات میں اختلاف ہو گیا کہ کیا اللہ کا کلام ایک معنیٰ ہے جو قائم بالذات ہے یا حروف و اصوات کا نام ہے جن کے ساتھ اللہ متکلم ہوا؟ جبکہ وہ پہلے متکلم نہ تھا یا وہ ہمیشہ متکلم رہا جب اس نے چاہا اور جس وقت چاہا اور جیسے چاہا کلام کیا' یعنی کلام قدیم ہے۔''

عبارت کی تشریح

اہل سنت کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے' جبکہ اختلاف درج ذیل باتوں میں ہے:

۱) متقدمین کے نزدیک قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ یہ حروف و اصوات کا نام ہے۔ اللہ ہمیشہ اپنے کلام کے ساتھ متکلم رہا۔ اُس نے جب چاہا اور جیسے چاہا ایسی آواز کے ساتھ متکلم رہا جو سنی جاتی ہے اور کلامِ قدیم ہے۔ اگرچہ معین آواز قدیم نہیں ہے۔ یہ قول جمہور اہل حدیث اور ائمہ سنت کا ہے۔ امام طحاوی کا یہی مذہب ہے۔ اس قول کے مطابق صفتِ کلام بالفعل قدیم ہے۔

۲) بعض محدثین و ائمہ اہل سنت کا کہنا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ حروف و اصوات کا نام ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ متکلم ہوا۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ متکلم نہ تھا۔ ان کے نزدیک صفت کلام ازلی ہے لیکن وہ بالقوۃ ازلی ہے نہ کہ بالفعل' جبکہ پہلے گروہ کے نزدیک صفتِ کلام بالقوۃ اور بالفعل دونوں اعتبار سے قدیم ہے۔

راجح موقف

ہمارے نزدیک راجح موقف دوسرا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ازل سے ہی بالفعل ماننے کا لازمی تقاضا یہ نکلتا ہے کہ اللہ ازل سے متکلم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ ازل سے کس سے کلام کر رہا ہے؟ مُتَکَلَّم کے بغیر کلام عبث ہے اور عبث کا صدور اللہ کی ذات سے ناممکن ہے۔ اللہ کی صفات کو بالفعل ازلی ماننے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم مخلوق کو بھی قدیم مانیں۔ کیونکہ صفتِ خلق جب ازلی صفت ہے' اس کا بالفعل ظہور بھی ازل سے ہے تو مخلوق بھی

(۱) شرح الطحاویۃ' علامہ ابن ابی العز حنفی' ص ۱۳۷۔

قدیم ہوئی۔ یعنی جب سے صفت خلق ہے اس وقت سے مخلوق ہے۔ لیکن بہر حال فرق اس میں یہ ہے کہ پہلے صفت خلق ہے پھر مخلوق ہے' لیکن پھر بھی تعدد قدماء لازم آئے گا۔ یعنی صفتِ خلق بھی قدیم اور اس صفتِ خلق کا بالفعل ہونا (یعنی مخلوق کا وجود) بھی قدیم ہوگا۔ اس لیے ہمارے نزدیک محدثین کا یہ موقف راجح ہے کہ اللہ کی تمام صفات ازلی ہیں لیکن بالقوۃ ازلی ہیں' بعد میں ان کا مواقع کی مناسبت سے بالفعل ظہور ہوتا رہا۔ مثلاً زید میں کلام کرنے کی صلاحیت ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ ابتدا سے اور ہر وقت کلام ہی کرتا آ رہا ہو۔ اسی طرح اللہ کی ذات میں کلام کی صلاحیت ازل سے ہے لیکن اس کا ظہور بعد میں ہوا۔

متأخرین احناف کا موقف

متأخرین ائمۂ احناف (جیسا کہ ابومنصور ماتریدی) کا قول ہے کہ کلام اللہ معنیٰ واحد ہے جو قائم بالذات ہے' جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر میں مخلوق کیا۔ اس قول کے مطابق کلام بس ایک معنیٰ واحد ہے۔ کلام الٰہی میں تعدد و تکثر بلحاظ دلالت (معنی) کے ہے نہ کہ بلحاظ مدلول (عبارت) کے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید اللہ کا کلام ہے لیکن اس کلام کی عبارتیں مخلوق ہیں اور ان عبارتوں کو کلام اللہ حقیقۃً نہیں بلکہ مجازاً کہتے ہیں' کیونکہ یہ عبارتیں اس کلام پر دلالت کرتی ہیں اور ان عبارات کے ساتھ اس کلام کی ادائیگی ہوتی ہے۔ ان عبارات کو عربی میں پیش کرو تو قرآن ہے' عبرانی میں ذکر کرو تو تورات ہے۔ یہ عبارات اصلاً کلام الٰہی نہیں ہیں بلکہ کلام الٰہی کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ اس لیے مجازاً ان عبارات کو کلام اللہ کہہ دیتے ہیں۔

متأخرین حنفیہ اور اہل سنت کے قول کا فرق

۱) متأخرین حنفیہ کے نزدیک جو کچھ مصاحف میں لکھا ہوا ہے وہ کلام اللہ نہیں ہے' بلکہ کلام الٰہی کی حکایت یا عبارت ہے۔ یعنی اصل کلام الٰہی قائم بالذات ہے اور جب قاری اس کو پڑھتا ہے یا کاتب اس کو مصحف میں لکھتا ہے تو اس مقروء یا مکتوب کلام کو ہم کلام الٰہی کی عبارت یا حکایت کہیں گے نہ کہ کلام الٰہی۔ اُن کے نزدیک یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مصحف میں اللہ کا کلام موجود ہے' کیونکہ سیاہی اور حروف کی بناوٹ کو اللہ کا کلام نہیں کہا جا سکتا۔

۲) اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ قاری جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو ہم اس کے بارے میں یہی کہیں گے کہ وہ کلام الٰہی کی ہی تلاوت کر رہا ہے۔ اس قاری کا فعل یعنی ''تلاوتِ قرآن'' مخلوق ہے' لیکن ''مقروء'' مخلوق نہیں ہے۔ اسی طرح جب کاتب کلام الٰہی

کو لکھتا ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس نے کلام الٰہی کو لکھا ہے۔ اگرچہ اس کا فعل ''قرآن کی کتابت'' مخلوق ہے لیکن ''مکتوب'' قرآن ہی ہے۔ کسی مصحف میں لکھے گئے قرآن کے بارے میں یہ کہنا تو درست ہے' کہ یہ فلاں کی کتابت ہے' کیونکہ کتابت ایک فعل ہے' لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ فلاں کا کلام ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ لہٰذا قرآن کی تلاوت کرتے وقت اگرچہ متکلم ہم ہی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ہمارا کلام نہیں ہوتا۔ ہم تو اس کلام کے قاری ہیں۔ کلام کی نسبت تو اُس ذات کی طرف ہوتی ہے جس سے وہ پہلی مرتبہ پیدا یا مرتب ہوا۔ مثلاً اگر کسی کتاب میں علامہ اقبال کا کوئی شعر نقل کیا گیا ہو تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ فلاں کاتب کا ہے' بلکہ ہم اس کی نسبت علامہ اقبال ہی کی طرف کریں گے۔ اسی طرح کلامِ الٰہی کی تلاوت کرتے وقت اگرچہ الفاظ ہمارے ہیں لیکن مقروء کلام اللہ ہی ہے۔

متأخرین حنفیہ پر امام ابن ابی العز حنفی کی تنقید

امام ابن ابی العز حنفی متأخرین احناف کے اس مسلک کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَلَوْ كَانَ مَا فِي الْمُصْحَفِ عِبَارَةً عَنْ كَلَامِ اللّٰهِ' وَلَيْسَ هُوَ كَلَامُ اللّٰهِ' لَمَا حَرُمَ عَلَى الْجُنُبِ وَالْمُحْدِثِ مَسُّهُ' وَلَوْ كَانَ مَا يَقْرَأُ الْقَارِئُ لَيْسَ كَلَامَ اللّٰهِ لَمَا حَرُمَ عَلَى الْجُنُبِ وَالْمُحْدِثِ قِرَاءَتُهُ بَلْ كَلَامُ اللّٰهِ مَحْفُوظٌ بِالصُّدُوْرِ' مَقْرُوْءٌ بِالْأَلْسِنِ' مَكْتُوْبٌ فِي الْمَصَاحِفِ' كَمَا قَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ فِي الْفِقْهِ الْأَكْبَرِ (۱)

''اور اگر وہ جو کہ مصحف میں ہے' اس کو کلام اللہ کی عبارت کہا جائے اور کلام اللہ نہ مانا جائے تو جنبی اور بے وضو کے لیے اس قرآن کا چھونا منع نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر قاری کا پڑھنا قرآن نہ ہوتا تو جنبی اور بے وضو انسان کے لیے اس کا پڑھنا ناجائز نہ ہوتا۔ بلکہ اللہ کا کلام سینوں میں محفوظ ہے' زبانوں سے پڑھا جاتا ہے' مصاحف میں لکھا ہوا ہے' جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے ''فقہ الاکبر'' میں کہا ہے''۔

عبارت کی تشریح

امام ابن ابی العز حنفی اہل سنت کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر زید حافظ

(۱) شرح الطحاویۃ' علامہ ابن ابی العز حنفی' ص ۱۴۱۔

قرآن ہے تو یہ کہنا درست ہے کہ زید کے سینے میں کلام الٰہی محفوظ ہے۔ زید جب کلام الٰہی کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے الفاظ اگرچہ مخلوق ہیں لیکن مقروء کلام الٰہی ہے۔ اسی طرح مصحف کے اوراق' سیاہی' لکھے ہوئے الفاظ اگرچہ مخلوق ہیں لیکن مکتوب کلام الٰہی ہے۔ دونوں میں باریک سا فرق ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے فرقے گمراہ ہو گئے۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

ابن ابی العز حنفی ''فقہ الاکبر'' کے حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلْقُرْآنُ فِی الْمَصَاحِفِ مَکْتُوْبٌ وَفِی الْقُلُوْبِ مَحْفُوْظٌ وَعَلَی الْاَلْسِنِ مَقْرُوْءٌ وَعَلَی النَّبِیِّ ﷺ مُنَزَّلٌ وَلَفْظُنَا بِالْقُرْآنِ مَخْلُوْقٌ وَالْقُرْآنُ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ وَمَا ذَکَرَ اللّٰہُ فِی الْقُرْآنِ عَنْ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ وَعَنْ فِرْعَوْنَ وَاِبْلِیْسَ فَاِنَّ ذٰلِکَ کَلَامُ اللّٰہِ اِخْبَارًا عَنْھُمْ وَکَلَامُ مُوْسٰی وَغَیْرِہٖ مِنَ الْمَخْلُوْقِیْنَ مَخْلُوْقٌ وَالْقُرْآنُ کَلَامُ اللّٰہِ لَا کَلَامُھُمْ وَسَمِعَ مُوْسٰی کَلَامَ اللّٰہِ فَلَمَّا کَلَّمَ مُوْسٰی کَلَّمَ بِکَلَامِہِ الَّذِیْ ھُوَ مِنْ صِفَاتِہٖ لَمْ یَزَلْ وَصِفَاتُہٗ کُلُّھَا خِلَافُ صِفَاتِ الْمَخْلُوْقِیْنَ یَعْلَمُ لَا کَعِلْمِنَا وَیَقْدِرُ لَا کَقُدْرَتِنَا وَیَرٰی لَا کَرُؤْیَتِنَا وَیَتَکَلَّمُ لَا کَکَلَامِنَا(۱)

''قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے' دلوں میں محفوظ ہے' زبانوں سے پڑھا جاتا ہے' نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے وقت ہمارے الفاظ مخلوق ہوتے ہیں جبکہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ اور قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام' فرعون و ابلیس کے جو واقعات ہیں یہ سارا اللہ کا کلام ہے۔ اللہ نے ہمیں ان کے بارے میں خبر دی ہے۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر مخلوقات کا اپنا کلام مخلوق ہے۔ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے' ان کا کلام نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوئے تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ کا کلام سنا۔ اور اللہ نے ان سے جو کلام کیا وہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں سے ہے جو ہمیشہ سے ہیں' اور اللہ کی تمام صفات مخلوق کی صفات سے مختلف ہیں۔ اللہ کا علم ہمارے علم جیسا نہیں ہے' اس کی قدرت ہماری قدرت جیسی نہیں ہے' اس کی رؤیت ہماری رؤیت جیسی نہیں ہے اور اس کا کلام ہمارے کلام جیسا نہیں ہے''۔

(۱) شرح الطحاویۃ' علامہ ابن ابی العز حنفی' ص ۱۳۸۔

قرآن مجید اور لوحِ محفوظ

قرآن مجید کے بارے میں درج ذیل آیات مذکور ہیں:

﴿فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج)

''وہ لوحِ محفوظ میں ہے''۔

﴿فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۝﴾ (الواقعة)

''وہ کتابِ مکنون میں ہے''۔

﴿فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝﴾ (الطور)

''وہ منتشر اوراق میں ہے''۔

ان تینوں مقامات سے مراد لوحِ محفوظ ہی ہے۔ اور ان آیات میں یہ بات بالکل واضح انداز میں بیان کی گئی ہے کہ یہ قرآن مجید لوحِ محفوظ میں بھی موجود ہے یا لکھا ہوا ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید میں ایک اور آیت مبارکہ مذکور ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۝﴾ (الشُّعراء)

''اور بے شک یہ پچھلے صحیفوں میں بھی موجود ہے''۔

یہاں ''ہ'' ضمیر سے مراد قرآن نہیں' بلکہ ذکرِ قرآن ہے' یعنی اس قرآن کا ذکر پچھلے انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ صحائف میں موجود ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ وغیرہ کا تذکرہ پہلی کتابوں میں موجود تھا۔ یہاں یہ معنی صحیح نہیں ہے کہ جو قرآن آپؐ پر نازل ہوا یہ پہلی کتابوں میں بھی موجود تھا' اس لیے کہ اس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے علاوہ کسی پر نازل نہیں فرمایا۔

خلاصۂ کلام

۱) اہلِ سنت کے مسلّمہ عقائد کے مطابق وہ کلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے صادر ہوا' جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے' بیت العزۃ (سمائے دنیا) پر جس کا نزول ہوا' جو آپؐ کے قلبِ مبارک پر اُتارا گیا' جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں' یہ سب قرآن ہے اور اللہ کا حقیقی کلام ہے۔

۲) متاخرین احناف کا قول ہے کہ قرآن معنیٰ واحد ہے اور قائم بالذات ہے' جبکہ مصاحف میں لکھا ہوا قرآن یا قاری کا پڑھا ہوا قرآن کلامِ الٰہی کی عبارت یا حکایت ہے'

کلام الٰہی نہیں ہے۔

راجح موقف

راجح موقف اہل سنت کا ہے' جس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:٦)

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی ایک آپؐ سے پناہ طلب کرے تو آپؐ اس کو پناہ دے دیں یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔''

اس آیت میں مشرکین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کا کلام سن لیں' حالانکہ وہ مشرک اللہ تعالیٰ سے تو اللہ کا کلام سننے سے رہے۔ بلکہ ظاہری بات ہے کہ مشرکین میں سے کوئی اگر اللہ کے کلام کو سنے گا تو اللہ کی جانب سے کسی مبلغ سے ہی سنے گا! اور یہاں اس مبلغ کے کلام کو جو کسی مشرک کو کلام اللہ پڑھ کر سنا رہا ہے' کلام الٰہی کہا گیا ہے۔

علامہ ابن ابی العز حنفی لکھتے ہیں:

وَالْآيَةُ تَدُلُّ عَلٰى فَسَادِ قَوْلِ مَنْ قَالَ اِنَّ الْمَسْمُوْعَ عِبَارَةٌ عَنْ كَلَامِ اللّٰهِ وَلَيْسَ هُوَ كَلَامَ اللّٰهِ فَاِنَّهُ تَعَالٰى قَالَ: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ﴾ وَلَمْ يَقُلْ حَتّٰى يَسْمَعَ مَا هُوَ عِبَارَةٌ عَنْ كَلَامِ اللّٰهِ وَالْاَصْلُ الْحَقِيْقَةُ۔ وَمَنْ قَالَ اِنَّ الْمَكْتُوْبَ فِي الْمَصَاحِفِ عِبَارَةٌ عَنْ كَلَامِ اللّٰهِ اَوْ حِكَايَةٌ كَلَامِ اللّٰهِ وَلَيْسَ فِيْهَا كَلَامُ اللّٰهِ فَقَدْ خَالَفَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَسَلَفَ الْاَئِمَّةِ وَكَفٰى بِذٰلِكَ ضَلَالَةً(١)

''اور آیت مبارکہ اُس شخص کے قول کے فاسد ہونے پر دلالت کر رہی ہے جو یہ کہتا ہے کہ جو سنا جاتا ہے وہ کلام اللہ کی عبارت ہے اور وہ کلام اللہ نہیں ہے' جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے: ''یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے'' اور یہ نہیں کہا کہ: ''یہاں تک کہ وہ کلام اللہ کی عبارت سن لے''۔ اور یہی اصل حقیقت ہے۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ جو کچھ مصاحف میں لکھا ہے وہ کلام اللہ کی عبارت یا حکایت ہے اور مصحف میں کلام اللہ نہیں ہے اس نے کتاب وسنت اور ائمہ سلف کی مخالفت کی اور یہی بات اس کی گمراہی کے لیے کافی ہے''۔

(١) شرح الطحاویۃ' علامہ ابن ابی العز حنفی' ص ١٤٣۔

کیا مصاحفِ دُنیویہ کو قرآن مجید کی مصدّقہ نقول کہنا صحیح ہے؟

۱) اہل سنت کے عقیدے کے مطابق مصاحفِ دُنیویہ میں موجود قرآن وہی ہے جو کہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ دونوں میں کسی قسم کا بھی فرق نہیں ہے۔ اس لحاظ سے قرآن مجید کو کلامِ الٰہی کی مصدّقہ نقول کہنا صحیح نہیں ہے' بلکہ یہ وہی حقیقی کلامِ الٰہی ہے جو اللہ کی ذات سے صادر ہوا۔ البتہ اِن مصاحف کے اوراق' کلامِ الٰہی کی کتابت کے لیے مستعمل سیاہی اور کاتب کے الفاظِ کتابت' یہ سب مخلوق ہیں۔ لہٰذا مصحف کے اِن اوراق' الفاظ' کتابت اور ان کے لیے مستعمل سیاہی کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کلامِ الٰہی کی مصدّقہ نقل ہے' اس میں اہل سنت کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قائل کا یہ عقیدہ بھی واضح ہو کہ وہ ان مصاحفِ دُنیویہ میں کلامِ الٰہی کے وجود کا منکر نہ ہو' جیسا کہ بعض متاخرینِ احناف نے مصاحفِ دنیویہ میں کلامِ الٰہی کے وجود کا انکار کیا ہے اور اسے کلامِ الٰہی کی عبارت یا حکایت قرار دیا ہے۔

۲) متاخرینِ احناف (اشاعرہ) کے موقف کے مطابق مصاحفِ دُنیویہ کو کلامِ الٰہی کی مصدّقہ نقول کہنا جائز بلکہ اصح ہے۔ ان کے نزدیک نہ تو کاتب کا مکتوب کلامِ الٰہی ہے اور نہ قاری کا مقروء۔ لیکن ائمہ اربعہ اور اہل سنت کا موقف اس سلسلے میں بالکل واضح ہے' جیسا کہ ابن ابی العزحنفی نے بیان کر دیا کہ ان سب کے نزدیک مصاحف میں موجود کلام' کلامِ الٰہی ہے نہ کہ کلامِ الٰہی کی عبارت یا حکایت' لہٰذا ائمہ اربعہ اور اہل سنت کے موقف کے مطابق مصاحفِ دُنیویہ کو کلامِ الٰہی کی مصدّقہ نقول کہنا درست نہیں ہے۔

۳) یہ اصولی بحث اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کا براہِ راست تعلق مصاحفِ دُنیویہ کے ادب و احترام سے ہے۔ اگر مصاحف میں کلامِ الٰہی کا انکار ہو گا تو اسی اعتبار سے مصاحف کے ادب و احترام کا معاملہ بھی رسمی ہو گا' جیسا کہ متاخرین احناف کے بعض فقہی اقوال سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔

(نوٹ: کلامِ الٰہی کی حفاظت و احترام سے متعلقہ یہ بحث ابھی جاری ہے۔ ان شاء اللہ اگلے شمارے میں مصاحف عثمانیہ کی تاریخ وارتقاء کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کی جائیں گی۔)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : ہرمجدون (Armageddon)

مصنف : الاستاذ امین محمد جمال الدین

مترجم : پروفیسر خورشید عالم

ضخامت : 108 صفحات ۔ قیمت: 60روپے

ملنے کا پتہ: ☆ صفہ پبلشرز' عطی بلڈنگ' 19A ایبٹ روڈ' لاہور

☆ نعمانی کتب خانہ' حق سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

''ہرمجدون'' عبرانی لفظ ہے۔ ''ہر'' کے معنی پہاڑ' اور ''مجیدو'' فلسطین کی ایک وادی کا نام ہے۔ پس ہرمجدون کا مطلب ہے ''مجیدو کا پہاڑ''۔ اس کتاب میں مصنف نے قرب قیامت کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ چونکہ ان واقعات میں فلسطین کو خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے کتاب کو یہ نام دیا گیا۔

مصنف کو قربِ قیامت کے حالات کی تحقیق وتفتیش کے ساتھ گہری مناسبت ہے۔ اُس نے بڑی کاوش کے ساتھ اُن تمام احادیث وآثار کا مطالعہ کیا ہے جن میں قربِ قیامت کے حالات کا ذکر ہے۔ مصنف کے خیال میں صدام کے کویت پر حملے سے ان واقعات کا آغاز ہو چکا ہے' اور امریکہ کا افغانستان اور عراق پر حملہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ مغربی یلغار کا اگلا نشانہ شام ہوگا۔ اب تیسری عالمگیر جنگ ہرمجدون (Armageddon) چھڑ جائے گی۔ سعودی عرب کے فرمانروا کی وفات کے بعد تین آدمیوں کا آپس میں قیادت پر اختلاف ہوگا۔ رمضان کے آغاز میں چاند گرہن ہوگا' وسط رمضان میں سورج گہنا جائے گا اور دوسرے عجیب و غریب فتنے سر اٹھائیں گے۔ پھر مہدی کا ظہور ہوگا' علماء کا ایک گروہ رکن یمانی اور مقامِ ابراہیمؑ کے درمیان ان کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ مہدی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے اور اسلامی فتوحات کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر دجال ظاہر ہوگا۔ اسی دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل

ہوں گے اور فلسطین میں ''باب لد'' کے پاس دجال کو قتل کر دیں گے۔ پھر یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا' وہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے مر جائیں گے۔ نزولِ عیسیٰؑ کے بعد مہدی زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ ایک حبشی کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوگی' اس کے کچھ دیر بعد سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور دابۃ الارض ظاہر ہوگا۔ شام کی جانب سے نرم ہوا چلے گی جو تمام مؤمنوں کی روح قبض کر لے گی اور کافروں کے سوا کوئی بھی نہیں بچے گا' اس کے بعد قیامت واقع ہو جائے گی۔

مصنف نے ان تمام واقعات کی تائید میں احادیث پیش کی ہیں' اور تنبیہ کی ہے کہ ان برے حالات میں ضروری ہے کہ مسلمان اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہوں' اُس کی پناہ چاہیں' اُس کی تسبیح وتقدیس میں لگے رہیں اور گڑگڑا کر اس کے سامنے دستِ دعا دراز کریں۔

قربِ قیامت کے حالات پر یہ مختصر مگر جامع تصنیف ہے۔ تیسری عالمگیر جنگ اور اس دنیا کے انجام کے بارے میں اس میں خاصی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔

(۲)

نام مجلّہ : مصباح التعلیم (سالِ اشاعت: 2005ء)

چیف ایڈیٹر : پروفیسر حسنات احمد شیخ

ضخامت : 178 صفحات ۔ ناشر: یونیورسٹی کالج آف ایجوکیشن' کوٹ لکھپت' لاہور

مصباح التعلیم یونیورسٹی کالج آف ایجوکیشن کا کالج میگزین ہے۔ رسالے کی یہ اشاعت کالج کے پرنسپل جناب عبدالنعیم کی سرپرستی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ یونیورسٹی کالج آف ایجوکیشن ایک تربیتی ادارہ ہے' جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو جو تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں' تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ یوں اس شمارے کے اکثر و بیشتر مضامین تعلیم و تدریس کے متعلق ہی ہیں۔

یہ مجلّہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اردو تحریریں' نظمیں اور غزلیں ہیں' جبکہ چند مضامین اور نظمیں پنجابی زبان میں بھی ہیں۔ مجلّے کے دوسرے حصے کی تحریریں انگریزی زبان میں ہیں۔ مجلّے کی تیاری میں اساتذہ اور طلبہ نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ اساتذہ کی تحریریں معیاری' معلومات افزا اور قابلِ قدر ہیں' جبکہ طلبہ کی تحریروں میں بعض تو بہت اچھی

ہیں جبکہ کچھ مبتدیانہ ہیں۔ کچھ مضامین سنجیدہ انداز کے ہیں' جبکہ کچھ مضامین تفریح طبع کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ سال کے دوران جو تعلیمی ٹور تشکیل دیے گئے ان کی باتصویر روداد یں رسالے میں موجود ہیں جو دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ کالج میں ہونے والی تقریبات کی رپورٹیں بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ اس طرح اس رسالے نے کالج کی تعلیمی' تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں کا ریکارڈ بھی قلمبند کرلیا ہے جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ البتہ کمپوزنگ میں جابجا غلطیاں ہیں جو قاری کے لیے تکدر خاطر کا باعث بنتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجلّہ جلدی میں تیار کیا گیا ہے اور کمپوزنگ کے بعد پروف ریڈنگ کے مرحلے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۳)

نام کتاب : کائنات کی وسعتیں' قرآن کی نظر میں

افادات : تفسیر الجواہر از علامہ طنطاوی

مترجم : ابو معاذ حافظ عبدالواجد صدیقی

ضخامت : 465 صفحات ۔ سائز: 20x30/8 قیمت: 300 روپے

ناشر : ہزارہ سوسائٹی فار سائنس ریلیجن ڈائیلاگ' مسلم ٹاؤن' مانسہرہ

زیر تبصرہ کتاب مصر کے بیسویں صدی کے بہت بڑے عالم الشیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر ''الجواہر فی تفسیر القرآن'' کے ملحق کا ترجمہ ہے۔ علامہ جوہری کی یہ تفسیر ۲۵ اجزاء اور ایک ملحق پر مشتمل ہے۔ علامہ جوہری نے اپنی تفسیر کے اس حصے میں بہت سی قرآنی آیات کی سائنسی توجیہات پیش کی ہیں۔ اس کام سے ان کے پیش نظر یہ ہے کہ ایک طرف وقت کے جدید فلسفہ کا اسی زبان میں جواب دیا جاسکے اور دوسری طرف مذہب اور سائنسی حقائق کے درمیان افہام وتفہیم کا راستہ تلاش کیا جاسکے۔

کتاب کا ترجمہ بہت عام فہم اور سلیس زبان میں ہے۔ کتاب بہت سارے سائنسی حقائق کی قرآن میں موجودگی کا انکشاف کرتی ہے' لیکن پھر بھی کہیں کہیں علامہ جوہری نے افراط وتفریط سے کام لیتے ہوئے قرآنی آیات کی ایسی تفسیر پیش کی ہے جن کی وہ متحمل نہ تھیں۔ لیکن علامہ کا کام اس لحاظ سے بہت ہی قابل قدر ہے کہ اس نہج پر یہ قرآن کی پہلی تفسیر

ہے جو کہ سامنے آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف علماء قرآنی آیات اور سائنسی نظریات و تحقیقات پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آج کے دور میں افراط و تفریط کی پگڈنڈیوں سے بچتے ہوئے آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تفسیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے مذہب اور سائنس کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جا سکے۔

(تبصرہ نگار: حافظ محمد زبیر)

بقیہ: نباتاتِ قرآن

کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس سیاہ کھجور کے بارے میں (بروایت حضرت ابو ہریرہؓ) فرمایا تھا کہ یہ جنت سے آئی ہے۔ حضور ﷺ نے دردِ سینہ میں مبتلا ایک شخص کو سات عجوہ کھجوریں گٹھلیوں کے ہمراہ کوٹ کر استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک اور حدیث کے مطابق اگر کوئی علی الصبح (نہار منہ) سات عجوہ کھجوریں کھالے تو وہ دن بھر زہر اور جادو کے اثر سے محفوظ رہے گا۔

کھجور جب خشک ہو کر چھوہارہ بن جاتی ہے تو اس کے فوائد مزید بڑھ جاتے ہیں۔ یہ ذائقے میں بھی میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے' بدن کو غذائیت دیتا اور طاقت بخشتا ہے۔ پانچ موٹے چھوہاروں کو دودھ میں جوش دیں۔ جب وہ نرم ہو جائیں تو آگ سے اتار لیں۔ چھوہارے کھائیں اور دودھ میں شہد ملا کر پئیں۔ اس کے چند روز کے استعمال سے بدن میں قوت پیدا ہو گی اور قوتِ باہ بڑھے گی۔ چھوہارہ اور ادرک ملا کر کھانے سے بلغمی کھانسی اور دمے میں فائدہ پہنچتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدراج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک جامع خطاب

☆ صفحات: 72 ☆ قیمت: 15 روپے

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور کی خصوصی پیشکش

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ——— حصہ ششم

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآن حکیم کی جامع ترین سورت

یعنی

اُمُّ المُسَبِّحات

سورۃ الحدید

کی مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمد

❁ دیدہ زیب پرنٹنگ ❁ خوبصورت ٹائٹل ❁ صفحات: 368
❁ اشاعت عام: 100 روپے ❁ اشاعت خاص: 200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 03-5869501

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹس کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I, II, III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501